

نظریۂ ارتقاء

کسی چیز کے بتدریج آگے بڑھنے کا نام ارتقاء ہے۔ انسان کا بچہ عمر کے ساتھ ساتھ بڑھتا جاتا ہے۔ یہ اس کا جسمانی ارتقاء ہے۔ پھر وہ تعلیم کی طرف آتا ہے، پہلی جماعت میں بیٹھتا ہے اور آہستہ آہستہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرتا ہے۔ یہ اس کا علمی ارتقاء ہے۔ کسی انسانی ذہن نے سپہ کی ساخت اور اس کے فوائد پر غور کیا پھر اسے عملی شکل دی، تو آج انسان نے محیر العقول مشینیں ایجاد کر لی ہیں، یہ انسان کا ذہنی ارتقاء ہے۔

ارتقاء کا یہ قانون صرف انسان میں نہیں بلکہ تمام موجودات میں پایا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آسمان دو دلوں (PERIODS) میں بنائے، اس کے بعد چار دنوں میں زمین اور اس میں بالیدگی کی قوتوں کو بنایا۔ اس سے ارتقاء کا قانون واضح طور پر ثابت ہے۔

پھر یہ بات بھی ہمارے مشاہدہ میں آچکی ہے کہ ان قدسی قوانین میں کچھ نہ کچھ مستثنیات بھی آجاتے ہیں۔ مثلاً تمام مائعات کی یہ خاصیت ہے کہ وہ جم کر یا ٹھوس شکل اختیار کر کے سکڑ جاتے ہیں اور یا ان کا حجم کم ہو جاتا ہے لیکن پانی جم کر پھیل جاتا ہے، یہ اس تمام قانون سے مستثنیٰ ہوا۔ پھر ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ بالکل صحیح عقل و حواس اور ذہن رکھنے والے میاں بیوی کے ہاں بلید الذہن بچہ پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ ارتقاء کے عام قانون قدرت سے مستثنیٰ ہوا۔ اسی طرح سنکھیا کی یہ غایت ہے کہ انسان کو ہلاک کر دیتا ہے، مگر کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ وہ کسی انسان کے لیے تریاق بن جاتا ہے یہ استثنائی صورت ہوتی۔ ان سب مثالوں سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ عام قوانین فطرت میں شاذ و نادر ہی سہی، تاہم مستثنیات کا وجود بھی ممکن ہے۔

کیا انسان اولاد ارتقاء ہے؟ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا انسان بھی اس ارتقائی

قانونِ فطرت کے تحت حیوانیت سے انسانیت کی منزل میں پہنچا ہے یا اس کی تخلیق مستثنیات کے تحت بحیثیت انسان ہی ہوتی ہے۔ اس سوال کے جواب میں کئی نظریات معروضِ وجود میں آچکے ہیں مثلاً:

- ۱۔ ایک طبقہ تو مذہبی لوگوں کا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے بحیثیت انسان ہی پیدا کیا ہے۔ اس تصور کے مطابق اللہ تعالیٰ نے آدم کو پیدا کیا۔ پھر اس سے اس کی بڑی پیدل، پھر اس جوڑے سے بنی نوع انسان تمام دنیا میں پھیل۔ عام ارتقائی قانون سے انسان کو مستثنیٰ قرار دینے کے لیے ان کے ہاں دلیل یہ ہے کہ انسان کائنات کا ایک حصہ ہونے کے باوجود دوسرے تمام حیوانات اور دیگر اشیاء سے کئی باتوں میں الگ ہے مثلاً اس میں قوتِ اختیار و ارادہ ہے۔ عقل و شعور ہے۔ پھر بادی النظر میں قرآن کے مطالعہ سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم کو بنا کر اس میں اپنی نوع پھونکی جو دوسری کسی چیز میں نہیں پھونکی گئی۔ اور اسی سے اسے عقل و شعور اور اختیار و ارادہ عطا کیا گیا۔ یہ چیز اسے عام ارتقائی قانون سے مستثنیٰ کر دیتی ہے۔ اس نظریہ کی حمایت بعض مغربی مفکرین نے بھی کی ہے۔
- ۲۔ دوسرا گروہ ادین کا ہے جو اسے خالص ارتقائی شکل کا نتیجہ قرار دیتے ہیں، کیوں کہ کائنات میں بالعموم ہی قانونِ جاری و ساری ہے۔ اس کے نظریہ کے مطابق زندگی اربوں سال پہلے ساحلِ سمندر سے نمودار ہوئی۔ پھر اس سے نباتات اور اس کی مختلف انواع ظہور پذیر ہوئیں پھر حیوانات پیدا ہوئے۔ انہی حیوانات سے انسان غیر انسانی اور نیم انسانی حالت کے مختلف مدارج سے ترقی کرتا ہوا مرتبہ انسانیت تک پہنچا ہے۔ اس تدریجی سفر کے طویل سفر میں کوئی نقطہ نظر ایسا نہیں ہو سکتا جہاں سے غیر انسانی حالت کا وجود ختم کر کے نوعِ انسانی کا آغاز تسلیم کیا جائے۔

بعض مسلمان مفکرین مثلاً ابن خلدون، ابن مسکویہ اور حافظ مسعودی نے بھی اشیائے کائنات میں مشابہت دیکھ کر اس نظریہ ارتقاء کی کسی حد تک تائید کی ہے، اس سے بھی آگے چلیے تو تاریخ کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلے ارسطو (۳۸۴ - ۳۲۲ ق م) نے یہ نظریہ پیش کیا تھا۔ (ذریعہ معلومات از عطش درانی ص ۷) اور انسائیکلو پیڈیا ارسود (مطبوعہ فیروز سنز، زیر عنوان ارتقاءیت) کے مطابق قدیم زمانہ میں تھیلیس، عناقسی، یندر، عناقسی میس، ایپی دوکل اور جوہر ہند فلاسفہ ارتقاء کے قائل تھے۔

انیسویں صدی عیسوی میں سرچارلس ڈارون (۱۸۰۸-۱۸۸۲ء) نے اصل انواع (*Origin of species*) لکھ کر اس نظریہ کو باضابطہ طور پر پیش کیا۔

پھر اس نظریہ ارتقاء کو تسلیم کرنے والوں میں بھی کافی اختلافات ہوتے ڈارون نے بندرہ انسان کو ایک ہی نوع قرار دیا کیونکہ جس وادارک کے پہلو سے ان دونوں میں کافی مشابہت پائی جاتی ہے، گریڈ ڈارون کے نظریہ کے مطابق انسان بندرہ کا چھپر ا بجائی ہے لیکن کچھ اہم پسندوں نے انسان کو بندرہ کی اولاد قرار دیا ہے۔ کچھ ان سے بھی آگے بڑھے تو کہا کہ تمام سفید فام انسان تو چمپینزی (*Chimpanzy*) سے پیدا ہوئے ہیں، سیاہ فام انسان کا باپ گرلا ہے اور لمبے ہاتھوں اور سرخ بالوں والے انسان تنگنہاں بندرہ کی اولاد ہیں یہ

پھر کچھ مفکرین کا یہ خیال بھی ہے کہ انسان بندرہ کی اولاد نہیں بلکہ بندرہ انسان کی اولاد ہے (انسان اور نظریہ ارتقاء ص ۱۱۸) اور اس رحمت قہقری کی مثالیں بھی کائنات میں پائی جاتی ہیں۔ قرآن سے بھی اس نظریہ کی کئی حد تک تائید ہو جاتی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ”فَعَلَّلْنَا لَمْ يَحْمَرُّ كَوْنًا وَفِرْدَةً“ (البقرة ۲۵۰) ”ہم نے ان بد کردار ہی اسرائیل سے کہا کہ ذلیل بندر بن جاؤ“ اس آیت کی تفسیر میں راجح قول یہی ہے کہ ان کے ذہن تو وہی پہلے ہی رہے تھے، مگر جسمانی حالت بدل دی گئی اور وہ بندر بن گئے۔

۳۔ تخلیق کائنات بشمولیت انسان کا ایک تیسرا نظریہ نظریہ آفت گیری (*Catastrophism*) ہے جس کے بانی کوپرنر ہیں۔ اس نظریہ کے مطابق تمام اقسام کے تباہی علیحدہ علیحدہ طور پر تخلیق ہوئے، یہ ارضی و سماوی آفات میں مبتلا ہو کر نیست و نابود ہو گئے۔ پھر کچھ اور حیوانات تخلیق ہوئے، یہ بھی کچھ عرصہ بعد نیست و نابود ہو گئے۔ اسی طرح مختلف ادوار میں نئے حیوانات پیدا ہوئے اور فنا ہوتے رہے ہیں۔ (اسلام اور نظریہ ارتقاء ص ۸۵) اس نظریہ کی بھی تائید قرآن کریم کی بعض آیتوں سے ہو جاتی ہے۔

چونکہ ڈارون کے نظریہ نے مذہبی دنیا میں ایک طرح کا اضطراب پیدا کر دیا ہے، لہذا ہم اس کا ذرا تفصیل سے جائزہ لینا چاہتے ہیں۔ پہلے اس نظریہ کو ذرا تفصیل سے پیش کریں گے پھر اسے زیر بحث لایا جائے گا۔

۱۔ مورخین نے تو ان مختلف اللون انسانوں کو نوح کے بیٹوں حام، سام، یا فٹ کی اولاد بتلایا ہے مگر یہ درست نہیں چمپینزی گرلا اور تنگنہاں کی اولاد قرار دیتے ہیں۔

نظریہ ارتقاء کیا ہے ؟

زندگی کی ابتداء ساحل سمندر پر پایاب پانیوں سے ہوئی۔ پانی کی سطح پر کائی نمودار ہوئی پھر اس کائی کے نیچے سے حرکت پیدا ہوئی۔ یہ زندگی کی ابتداء تھی۔ پھر اس سے نباتات کی مختلف شکلیں بنتی گئیں۔ جو ثمرہ حیات ترقی کر کے حیوان بن گیا۔ پھر یہ حیوان بنا، یہ حیوان ترقی کرتے کرتے پردار اور بازوؤں والے حیوانات میں تبدیل ہوا۔ پھر اس نے فقری جانور کی شکل اختیار کی پھر انسان کے مشابہ حیوان بنا اور اس کے بعد انسان اول بنا۔ جس میں عقل و فہم اور تکلم کی صلاحیتیں نہیں تھیں۔ بالآخر وہ صاحب فہم و ذکاۃ انسان بن گیا۔ ان تمام تبدلات و تغیرات اور ارتقاء نے زندگی میں کتنی مدت صرف ہوئی، اس کا اندازہ کچھ اس طرح بتلایا جاتا ہے۔

آج سے دو ارب سال پیشتر سمندر کے کنارے پایاب پانی میں کائی کی نمود شروع ہوئی، یہ زندگی کا آغاز تھا۔ ۶۰ کروڑ سال قبل ایک غلوی جانور پیدا ہوئے۔ مزید ۳ کروڑ سال بعد اس غلوی جانور سے دیگر غلوی جانور پیدا ہوئے۔ ۴۵ کروڑ سال قبل پتوں کے بغیر پودے ظاہر ہوئے اور اسی دور میں ریڑھ کی ہڈی والے جانور پیدا ہوئے۔ ۴۰ کروڑ سال قبل مچھلیوں اور مچھلوں کی نمود ہوئی۔ ۳۰ کروڑ سال قبل بڑے بڑے دلدلی جانور پیدا ہوئے۔ یہ عظیم الجثہ جانور ۸ فٹ تک لمبے اور ۲۵ ٹن تک وزنی تھے۔ ۱۳ کروڑ سال بعد یا آج سے ۴ کروڑ سال پہلے ان عظیم الجثہ جانوروں کا خاتمہ ہو گیا۔ ۴ کروڑ سال قبل ہاتھیوں، گھوڑوں اور بندروں کی نمود ہوئی۔ ۲ کروڑ سال قبل بے دم بوزن (ape) نمودار ہوئے اور ڈیڑھ کروڑ سال بعد یعنی آج سے ایک کروڑ سال پہلے بے دم بوزن سیدھا ہو کر چلنے لگا۔ (یہی وہ بندر ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ انسان کا جدِ اعلیٰ ہے) اس سے ۲۰ لاکھ سال بعد یا آج سے ستر لاکھ سال پہلے اس بے دم بوزن کی ایک قسم تھکن پوس سے پہلی انسانی نسل پیدا ہوئی۔ مزید ۵۰ لاکھ سال یا آج سے ۲۰ لاکھ سال پہلے، پہلی باشعور انسانی نسل پیدا ہوئی جس نے پھر کا ہتھیار اٹھا یا مزید ۲ لاکھ سال بعد اس میں ذہنی ارتقاء ہوا اور انسانی نسل نے فاروں میں رہنا شروع کیا۔ (ذریعہ معلومات از عطش درانی ص ۷ تا ۹)

ڈارون نے سب سے پہلے کتاب اصل الانواع ۱۸۵۹ء میں لکھی، پھر اس کے بعد اصل الانسان (ORIGIN OF MAN) اور تسلسل انسانی (DESCENT OF MAN) لکھ کر اپنے نظریہ کی تائید مزید کی۔ ڈارون نے اس نظریہ ارتقاء کو مندرجہ ذیل چار اصولوں پر استوار کیا ہے۔

۱- تنازع البقاء (Struggle for existence)

اس سے مراد زندگی کی بقا کے لیے کشمکش ہے، جس میں صرف وہ جاندار باقی رہ جاتے ہیں جو زیادہ مکمل اور طاقتور ہوں اور کمزور جاندار ختم ہو جاتے ہیں۔ مثلاً وحشی جنگل میں وحشی بیل ایک ساتھ چرتے ہیں۔ پھر جو اُن میں طاقتور ہوتا ہے وہ گھاس پر قبضہ جما لیتا ہے اور اس طرح مزید طاقتور ہو جاتا ہے مگر کمزور، خوراک کی نایابی کے باعث کمزور تر ہو کر بالآخر ختم ہو جاتا ہے اسی کشمکش کا نام تنازع البقاء ہے۔

۲- اس کا دوسرا اصول طبعی انتخاب (natural selection) ہے۔ اس سے اس کی مراد یہ ہے کہ مثلاً اوپر کی مثال میں وحشی بیل دوڑ کی مسافت طے کرتے اور دشوار گزار راستوں سے گزرتے ہیں تو جو طاقتور ہوتے ہیں وہی یہ مسافت طے کر پاتے ہیں اور اپنے آپ کو خطرات سے محفوظ کر لیتے ہیں۔ گویا فطرت خود طاقتور اور مضبوط کو باقی رکھتی اور کمزور و ناقص کو ختم کر دیتی ہے۔ اگرچہ مندرجہ بالا دو الگ الگ اصول بتلائے گئے ہیں مگر دونوں کا نتیجہ دراصل ایک ہی ہے جو بصدائق ہے

تقدیر کے قاضی کا یہ فتوے ہے ازل سے
ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاہات؛

کمزور جنس کے ختم ہو جانے کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

۳- ماحول سے ہم آہنگی (Adaptation)

اس کی مثال یوں سمجھیے کہ شیر ایک درندہ گوشت خور جانور ہے۔ فطرت نے اسے شکار کے لیے پنجے اور گوشت کھانے کے لیے لُوکیلے دانت عطا کیے ہیں۔ اب اگر اسے مذہب دراز تک گوشت نہ ملے تو اس کی دوہی صورتیں ہیں۔ یا تو وہ بھوک سے ختم ہو جائے گا یا نہات کھانے لگ جائے گا۔ اس دوسری صورت میں اس کے تیز دانت اور پنجے رفتہ رفتہ خود بخود ختم ہو جائیں گے اور ایسے نئے اعضا۔ وجود میں آنے لگیں گے جو موجودہ مشیت کے مطابق ہوں۔ اس کی آئینیں بھی طویل ہو کر سبزی خور جانوروں کے مشابہ ہو جائیں گی۔ اسی طرح اگر شیر کو خوراک ملنے کی واحد صدمت یہ ہو کہ یہ اسے کسی درخت پر چڑھ کر حاصل کرنی پڑے تو ایسے اعضا۔ پیدا ہونے شروع ہو جائیں گے جو درختوں پر چڑھنے میں مدد دے سکیں۔

۴- قانونِ وراثت؛ (Law of heritance)

اس کا مطلب یہ ہے کہ،

اصول ملکی رُرد سے یعنی مشیت اور ماحول کے اختلاف سے جو تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں وہ نسل بعد نسل آگے منتقل ہوتی جاتی ہیں تا آنکہ یہ اختلاف فردی نہیں بلکہ نوری بن جاتا ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ دوا لگ لگائیں ہیں، جیسے گدھا اور گھوڑا ایک ہی نوع ہیں۔ مگر گدھا گھوڑے سے اس لیے مختلف ہو گیا کہ اس کی معاشی صورت حال بھی بدل گئی اور اصول معاش کے لیے اس کی جدوجہد میں بھی اضافہ ہو گیا۔

یہ بے ڈارون کے نظریہ ارتقاء کا خلاصہ جو اس وقت بھی صرف نظریہ ہی تھا اور آج بھی نظریہ ہی ہے۔ اس نظریہ کو کوئی ایسی ٹھوس بنیاد دیتا نہیں ہو سکی جس کی وجہ سے یہ نظریہ سائنس کا قانون (Scientific Law) بن سکے۔ اس نظریہ پر بعد کے مفکرین نے شدید اعتراضات کیے، مثلاً،

نظریہ ارتقاء پر اعتراضات:

۱۔ زندگی کی ابتداء کیسے ہو گئی؟ معلول تو موجود ہے لیکن علت کی کڑی نہیں ملتی۔ گویا اس نظریہ کی بنیاد ہی سائنسی لحاظ سے کمزور ہے۔ اس سلسلہ میں پرویز صاحب اپنی کتاب ”انسان نے کیا سوچا“ کے لفظ ۵۵ پر رقمطراز ہیں:

”یہ تو ڈارون نے کہا تھا لیکن خود ہمارے زمانے کا ماہر ارتقاء (Simpson) زندگی کی ابتداء اور سلسلہ علت و معلول کی اولین کڑی کے متعلق لکھتا ہے: زندگی کی ابتداء کیسے ہو گئی؟ نہایت دیانتداری سے اس کا جواب یہ ہے کہ ہمیں اس کا کچھ علم نہیں.... اس معمہ کو حل کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے اور رفتہ رفتہ اس کے قریب پہنچا جا رہا ہے.... لیکن اس معمہ کا آخری نقطہ (یعنی زندگی کا نقطہ آغاز) وہ ہے جو سائنس کے انکشافات کی دسترس سے باہر ہے اور شاید انسان کے حیطہ ادراک سے ہی باہر.... کائنات کے آغاز اور سلسلہ علت و معلول کی اولین کڑی کا مسئلہ لایحل ہے اور سائنس اس تک نہیں پہنچ سکتی.... یا اولین کڑی راز ہے اور میرا خیال ہے کہ ذہن انسانی اس راز کو کبھی نہیں پاسکے گا۔ ہم اگرچہ اپنی اپنے طریق پر اس علتِ اولیٰ کے حضور اپنے سر جھکا سکتے ہیں لیکن اسے اپنے ادراک کے دائرے میں کبھی نہیں لاسکتے“

گویا نظریہ ارتقاء کے مادہ پرست قائلین کو آج تک اس کے لیے کوئی سائنسی اور حلی دلیل

متباہ نہیں ہو سکی۔

۲۔ دوسرا اعتراض یہ ہے کہ ارتقاء کا کوئی ایک واقعہ بھی آج تک محض انسان نے مشاہدہ نہیں کیا یعنی کوئی پٹریا ارتقاء کر کے مرغابن گئی ہو یا گدھا ارتقاء کر کے گھوڑا بن گیا ہو یا لوگوں نے محض بندر کو انسان بننے دیکھا ہو۔ نہ ہی یہ معلوم ہو سکا ہے کہ فلاں دور میں ارتقاء ہوا تھا۔ جس طرح جملہ حیوانات ابتدائے آفرینش سے تحقیق کیے گئے ہیں آج تک اسی طرح چلے آتے ہیں، ان میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ البتہ بعض ایسی مثالیں ضرور ملتی ہیں جو نظریہ ارتقاء کو رد کرتی ہیں مثلاً ریشم کا کیڑا جو عموماً موسم برسات میں شہوت کے پتوں پر گزیر اوقات کرتا ہے۔ جب ساٹھ دن کا ہو جاتا ہے تو اس کا رنگ سیاہ سے سفید ہو جاتا ہے۔ اس کے منہ سے ایک مادہ تاروں کی شکل میں نکلتا ہے جسے یہ اپنے جسم کے گرد لپیٹنا شروع کر دیتا ہے۔ یہ تار ساٹھ ہی ساٹھ خشک ہوتے جاتے ہیں۔ ریشم کے کیڑے کے گرد تاروں کا یہ جال جب اخروٹ کے برابر ہو جاتا ہے تو اس کے اندر پھیرا مر جاتا ہے اور اس کے سیاہ مادے سے ایک سفید تلی بن جاتی ہے۔ جب یہ باہر نکلتی ہے تو نرمو مادہ کا مٹاپ ہوتا ہے پھر مادہ اندر سے دیتی ہے اور دونوں نرمو مادہ مر جاتے ہیں۔ اس کیڑے کا بالخصوص اس لیے ذکر کیا گیا ہے کہ انسان زمانہ قدیم سے ریشم حاصل کر رہا ہے اور اس کیڑے کی داستانِ حیات اس کے سامنے رہتی ہے۔ اس کیڑے کی داستانِ حیات میں نہ بھی تبدیلی ہوتی نہ ہی ارتقاء کا عمل کبھی پیش آیا۔ اسی طرح بعض کمرتبہ کے بحری جانور جو ابتدائے زمانہ میں پائے جاتے تھے، آج بھی اسی شکل میں موجود ہیں۔ ان پر ارتقاء کا کوئی عمل نہیں ہوا۔ حشرات الارض کا وجود بھی نظریہ ارتقاء کی تردید کرتا ہے اس لیے بعض معرکین ارتقاء کے منکر ہیں، اس کے بجائے تخلیقِ خصوصی (special creation) کے قائل ہیں۔ یعنی ہر نوع زندگی کی تخلیق بالکل الگ طور پر ہوتی ہے۔ ایک مفکر (de vires) ارتقاء کے بجائے انتقال (Mutation) کا قائل ہے جسے آج کل فجائی ارتقاء (Emergent evolution) کا نام دیا جاتا ہے۔

۳۔ نظریہ ارتقاء پر تیسرا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ ان کی درمیانی کڑیاں موجود نہیں۔ مثلاً جوڑوں والے اور بغیر جوڑوں والے جانوروں کی درمیانی کڑی موجود نہیں۔ فقری اور غیر فقری جانوروں کی درمیانی کڑی بھی مفقود ہے۔ مچھلیوں اور ان حیوانات کی درمیانی کڑی بھی غائب ہے جو خشکی اور پانی کے جانور کہلاتے ہیں۔ اسی طرح رینگنے والے جانوروں اور پرندوں، سینگنے والے

جانوروں اور ممالیہ جانوروں کی درمیانی کڑیاں بھی مفقود ہیں۔ فلسفہ ارتقاء کی یہ اصل دشواری ہے۔ جو سالہا سے زیر بحث چلی آرہی ہے۔

بعض نظریہ ارتقاء کے قائلین اس کا یہ جواب دیتے ہیں کہ درمیانی کڑی کا جب کام پورا ہو چکتا ہے تو وہ از خود غائب ہو جاتی ہے۔ اس جواب میں جتنا وزن یا معقولیت ہے اس کا آپ خود اندازہ کر سکتے ہیں۔

۴۔ چونکہ اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ جب اس نظریہ کی رُو سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ پہلا انسان کمزور جسم اور ناقص العقل تھا تو اس نے شیروں اور چیتوں کے درمیان گزارہ کیسے کیا اور اسس کمزوری اور بے عقلی کے باوجود تنازع للبقا میں کامیاب کیسے ہو گیا؟

۵۔ پانچواں اعتراض بڑا وزنی ہے اور وہ یہ ہے کہ ابتدائے زندگی سے بندرتک جو شعوری ترقی دو ارب سال میں واقع ہوتی ہے، بندر اور انسان کا درمیانی شعوری فرق اس سے بہت زیادہ ہے جس کے لیے ارب ہا سال کی مدت درکار ہے۔ جبکہ زمین کی عمر صرف ۳ ارب سال بتائی جاتی ہے۔ یہ ذہنی ترقی انسان میں یکدم کیونکر آگئی؟

۶۔ ڈارون نے نظریہ ارتقاء کے جو اصول بتلائے ہیں وہ مشاہدات کی رُو سے صحیح ثابت نہیں ہوتے، مثلاً:

۱۔ ایک اصول قانون وراثت ہے۔ ڈارون کہتا ہے کہ لوگ کچھ عرصہ تک کتوں کی دُم کاٹتے رہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کتے بے دُم پیدا ہونے لگے۔ جس پر اعتراض یہ ہوتا ہے کہ عرب اور عبرانی لوگ صدیوں سے غنہ کرواتے چلے آئے ہیں لیکن آج تک کوئی غنہ بچہ پیدا نہیں ہوا۔

۲۔ ماحول سے ہم آہنگی پر یہ اعتراض ہے کہ انسان کے پستانوں کا بدنماداغ آج تک کیوں باقی ہے جس کی کسی دور میں بھی ضرورت پیش نہیں آئی۔ اور انسان سے کمتر درجے کے جانوروں (دنوں) میں یہ داغ موجود نہیں تو انسان میں کیسے آگیا؟ علاوہ ازیں یہ کہ ایک ہی جغرافیائی ماحول میں رہنے والے جانوروں کے درمیان فرق کیوں ہوتا ہے؟

۳۔ رکاز کی دریافت بھی نظریہ ارتقاء کو بالکل باطل قرار دیتی ہے، رکاز (Palaeontology) سے مراد انسانی کھوپڑیاں یا جانوروں کے وہ پنجر اور ہڈیاں ہیں جو زمین میں مدفون پائی جاتی ہیں۔ نظریہ ارتقاء کی رُو سے کمتر درجے کے جانوروں کی ہڈیاں زمین کے زیرِ حصہ میں پائی جانی چاہئیں

جبکہ معاملہ اس کے برعکس ہے۔ ایسی ہڈیاں عموماً زمین کے بالائی حصہ میں ملی ہیں۔ ارتقائی یہ بھی کہتے ہیں کہ انسان لاکھوں سال قبل جسمانی اور عقلی لحاظ سے ناقص تھا۔ بالآخر تکمیل کی طرف آیا۔ رکاز کی دریافت اس بات کی بھی ترمید کرتی ہے کیونکہ بالائی طبقوں میں جو رکاز ملے ہیں وہ غیر مکمل اور ناقص انسان کی یادگار ہیں اور زیریں طبقوں میں اعلیٰ انسان کے رکاز ملے ہیں۔ حالانکہ معاملہ اس کے برعکس ہونا چاہیے تھا۔

نظریہ ارتقاء اور مغربی مفکرین:

یہ ہیں وہ اعتراضات جنہوں نے اس نظریہ کے بھرپور تکمیل کے خلاف دیا ہے۔ گزشتہ ڈیڑھ صدی نے اس نظریہ میں استحکام کی بجائے اس کی جڑیں بھی ہلا دی ہیں۔ اب اس نظریہ کے متعلق چند مغربی مفکرین کے اقوال بھی ملاحظہ فرمائیے:

۱۔ ایک اطالوی سائنسدان روزا کتا ہے کہ گزشتہ ساٹھ سال کے تجربات نظریہ ڈارون کو باطل قرار دے چکے ہیں۔ (اسلام اور نظریہ ارتقاء)

۲۔ ڈی وریز (Deviere) ارتقاء کو باطل قرار دیتا ہے، وہ اس نظریہ کے بجائے (Mutation) یا انتقال نوع کا قائل ہے۔ (ایضاً)

۳۔ ولانس (Wallace) عام ارتقاء کا قائل ہے لیکن وہ انسان کو اس سے مستثنیٰ قرار دیتا ہے۔ (ایضاً ص ۶۱)

۴۔ فرخو کتا ہے کہ انسان اور بندر میں بہت فرق ہے اور یہ کہنا بالکل لغو ہے کہ انسان بندر کی اولاد ہے۔

۵۔ میفرٹ کتا ہے کہ ڈارون کے مذہب کی تائید ناممکن ہے اور اس کی رائے بچوں کی باتوں سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔

۶۔ آغا سینر کتا ہے کہ ڈارون کا مذہب سائنسی لحاظ سے بالکل غلط اور بے اصل ہے اور اس قسم کی باتوں کا علم سائنس سے کوئی تعلق نہیں ہو سکتا۔ (ایضاً ص ۶۲)

۷۔ ہکسلی (Huxley) کتا ہے کہ جو لائل ارتقاء کے لیے دیے جاتے ہیں ان سے یہ بات قطعاً ثابت نہیں ہوتی کہ نباتات یا حیوانات کی کوئی نوع کبھی طبعی انتخاب سے پیدا ہوئی ہو۔ (ایضاً ص ۱۱۸)

۸۔ ٹنڈل کتا ہے کہ نظریہ ڈارون قطعاً ناقابل التفات ہے کیونکہ جن مقدمات پر اس نظریہ

کی بنیاد ہے وہ قابل تسلیم ہی نہیں ہیں۔

نظریۂ ارتقاء کی مقبولیت،

اب سوال یہ ہے کہ اگر یہ نظریۂ ارتقاء اتنا ہی غیر سائنٹیفک ہے تو یہ قبول کیسے ہو گیا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس کا پرچار کرنے والوں میں مادہ پرست، دہریت پسند اور اشتراکیت نواز سب شامل ہو جاتے ہیں۔ دہریت، مادہ پرستی، لاادریت اور اشتراکیت بذات خود الگ الگ مذہب ہیں۔ یہ نظریہ چونکہ الحاد اور خدا سے انکار کی طرف لے جاتا ہے لہذا انہیں ایک دلیل کا کام دیتا ہے۔

ڈارون خود پہلے خدا پرست تھا۔ جب اس نے کتاب اصل الانواع لکھی تو اس وقت وہ لاادریت کی طرف مائل ہو گیا۔ پھر جب اس نے اور بھی دو کتابیں لکھیں اور اپنے نظریہ میں پختہ ہو گیا تو خدا کا منکر بن گیا اور اہل کلیسا نے اس پر کفر و الحاد کا فتوہ لگا دیا۔ نظریۂ ارتقاء اور مفکرین قرآن:

سوچنے کی بات ہے کہ وہ نظریہ جسے مغربی مفکرین ناقابل اعتماد ٹھہرا چکے ہیں تو ہمارے قرآنی مفکرین کو احادیث جیسے قطعی علم کو رد کر کے اس "یقینی علم" کو سینے سے لگانے کی کیا ضرورت تھی؟ سائنسی نظریات کا تو یہ حال ہے کہ جب وہ اپنے تجرباتی اور تحقیقی مراحل سے گزرنے کے بعد سائنسی قانون (Law) بن جاتے ہیں۔ تب بھی انہیں آخری حقیقت قرار نہیں دیا جاسکتا بلکہ میں آنے والے مفکر ایسے سائنسی قوانین کو رد کر دیتے ہیں۔ نیوٹن کے دریافت کردہ متوازن کشش ثقل کو آئن سٹائن نے مشکوک قرار دیا۔ یہی صورت حال اس کے قوانین حرکت کی سے تو ایسی صورت حال میں ان نظریات کو تاویل و تحریف کے ذریعہ قرآن سے ثابت کرنا کوئی دینی خدمت یا قرآنی فکر قرار دیا جاسکتا ہے؟

پرویز صاحب نے اس نظریۂ ارتقاء کو دو شرائط کے ساتھ اپنایا ہے:

۱۔ یہ کہ پہلے جرثومہ حیات میں زندگی کسی نہ کسی طرح خود بخود ہی پیدا انہیں ہوئی تھی بلکہ یہ زندگی خدا نے عطا کی تھی۔

۲- انسان کا فکرو شعور ارتقاء کا نتیجہ نہیں بلکہ نفع خداوندی کا نتیجہ ہے اور یہ کہ نفع روح خداوندی فحائی ارتقاء کے طور پر واقع ہوا۔ فحائی ارتقاء کے نظریہ کا موجد موجودہ دور کا امام لائڈ مارگن ہے جس نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ فحائی ارتقاء ممکن العمل ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ اگر خدا ہی کو خالق زندگی اور نفع روح کا بطور فحائی ارتقاء عامل تسلیم کرنا ہے تو پھر کیوں نہ آدم کو عام قانون ارتقاء سے مستثنیٰ قرار دے دیا جائے۔ استثناء کا قانون بھی تو آخر اس کائنات میں موجود ہے۔ گو اس قانون تک انسان کی دسترس آج تک نہیں ہو سکی، پھر یہ سوال بھی بڑا ذہنی ہے کہ جب نوع انسان پہلے سے چلی آ رہی تھی تو کیا نفع روح اس نوع کے سارے افراد میں ہوا تھا یا محض فرد واحد میں؟ اگر محض فرد واحد میں ہوا تو وہ کون تھا اور یہ واقعہ کس دور میں ہوا؟ یہ ایسے سوالات ہیں جن کا ان حضرات کے پاس کوئی جواب نہیں۔

مفکرین قرآن کے قرآنی دلائل،

حقیقت میں دیکھا جائے تو قرآن میں کوئی ایسی نص موجود نہیں جو انسان کو نظریہ ارتقاء کی کڑی میں مسلک کر دے، تاہم جن آیات سے استشہاد کیا جاتا ہے وہ درج ذیل ہیں:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجِمَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَاءً (النساء)

”اے لوگو! خدا سے ڈرو جس نے تمہیں ایک نفس سے پیدا کیا پھر اس سے اس کا جوڑا بنایا۔ پھر ان دونوں سے کثیر مرد اور عورت (پیدا کر کے روئے زمین پر) پھیلا دیے۔“

یہ آیت اپنے مطلب میں صاف ہے کہ نفس واحد سے مراد آدم علیہ السلام ہیں لیکن ہمارے یہ دوست نفس واحد سے مراد پہلا جرثومہ حیات لیتے ہیں۔ اس جرثومہ حیات کے متعلق نظریہ ہے کہ وہ کٹ کر دو ٹکڑے ہو گیا پھر ان میں سے ہر ایک بڑا ہو کر پھر کٹ کر دو دو ٹکڑے ہوتا گیا۔ اس طرح زندگی میں وسعت پیدا ہوتی گئی جو جمادات سے نباتات، نباتات سے حیوانات اور حیوانات سے انسان تک پہنچی ہے۔

یہ قصور اس لحاظ سے غلط ہے کہ ”خلق منہما زوجمما“ کے الفاظ اس بات کی دلیل ہیں کہ اس جوڑے سے آئندہ نسل تو الود و ناسل کے ذریعہ چلی تھی جبکہ جرثومہ حیات کی

صورت یہ نہیں ہوتی۔ آج بھی جراثیم کی افزائش اسی طرح ہوتی ہے کہ ایک جراثیم کٹ کر دوسرے بن جاتا ہے۔ پھر ان میں سے ہر ایک کٹ کر دوسرے بن جاتا ہے۔ اس طرح افزائش ہوتی چلی جاتی ہے، ان میں تو الدو تناسل نہیں ہوتا۔ لہذا وہ ایک جراثیم کے دو ٹکڑے تو کھلا سکتے ہیں روج نہیں کھلا سکتے۔

۲۔ دوسری آیت یہ ہے:

”اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ - خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ -“

(العلق ۲۱)

(اے محمد!) اپنے پروردگار کا نام لے کر پڑھیے جس نے (کائنات کو) پیدا کیا۔ جس نے انسان کو خون کی پھٹکی سے بنایا۔

اس آیت میں ”علق“ کا لغوی معنی جما ہوا خون بھی ہے اور جنک بھی۔ ہمارے یہ دست اس سے دوسرا معنی مراد لیتے ہیں اور اسے رحم مادر کی کیفیت قرار نہیں دیتے۔ بلکہ اس سے ارتقائی زندگی کے سفر کا وہ دور مراد لیتے ہیں جب جنک کی قسم کے جانور وجود میں آئے اور کہتے ہیں کہ انسان انہی جانداروں کی ارتقائی شکل ہے۔

اس اشکال کو، کہ آیا یہ رحم مادر کا قصہ ہے یا ارتقائے زندگی کے سفر کی داستان درج ذیل آیت دُور کر دیتی ہے:

”ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ

عِظَامًا فَكَسْنَا الْعِظَامَ لَحْمًا ثُمَّ أَنْشَأْنَاهُ خَلْقًا آخَرَ فَبَارَكْ

اللَّهُ أَحْسَنَ الْخَالِقِينَ“ (المؤمنون ۱۴)

”پھر نطفہ کا لوتھڑا (علق) بنایا۔ پھر لوتھڑے کی بوٹی بنائی۔ پھر بوٹی کی ہڈیاں

بنائیں پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھایا۔ پھر اس (انسان کو) نئی صورت میں بنادیا

تو خدا سب سے بہتر بنانے والا بڑا برکت ہے۔“

انسان کی پیدائش کے یہ تدریجی مراحل صاف بتا رہے ہیں کہ یہ رحم مادر میں ہونے والے تغیرات ہیں، کیونکہ ارتقائے زندگی کے مراحل ان منطبق نہیں ہوتے۔ نیز یہ بھی کہ قرآن مجید نے ”علق“ یا ”علقة“ سے مراد رحم مادر میں جما ہوا خون ہی لیا ہے۔ اس سے ارتقائی نظریہ کی جنک مراد نہیں۔

۳- تیسری آیت یہ ہے :

”وَلَقَدْ خَلَقَكُمْ أَطْوَارًا“

(۱) ”حالانکہ اسی نے تم سب کو مختلف حالات میں پیدا کیا ہے۔“ (تفسیر ثنائی)

(۲) ”حالانکہ اس نے تم کو طرح طرح (کی حالتوں) میں پیدا کیا ہے۔“ (فتح محمد جالندھری)

(۳) ”حالانکہ اس نے تم کو طرح طرح سے بنایا ہے۔“ (تفہیم القرآن — اور اس سے مولانا مودودی

نے وہی تخلیقی مراحل مراد لیے ہیں جو رحم مادر میں ہوتے ہیں۔

پرویز صاحب اس آیت سے ارتقاء زندگی کے مراحل مراد لیتے ہیں۔ لیکن کوئی

ایسی وجہ نہیں کہ اس سے رحم مادر کے مراحل مراد نہ لیے جائیں جبکہ سورۃ علق کی مندرجہ بالا آیت

اس کی وضاحت بھی کر رہی ہے اور کوئی ایسا قرینہ بھی موجود نہیں جس سے پرویز صاحب کے

نظریہ کی تائید ہو سکے۔

۴- ”وَاللّٰهُ اَنْبَتَكُمْ فِى الْاَرْضِ نَبَاتًا“

(۱) ”اور خدا ہی نے تم کو زمین سے پیدا کیا ہے۔“ (فتح محمد)

(۲) ”اللہ نے تم کو زمین سے پیدا کیا۔“ (تفسیر ثنائی)

(۳) ”اور اللہ نے تم کو زمین سے عجیب طرح اگایا۔“ (تفہیم القرآن)

پرویز صاحب اس کا ترجمہ کرتے ہیں۔ ”اور ہم نے تمہیں زمین سے اگایا ایک طرح کا اگانا۔“ اور

اس سے مراد یہ لیتے ہیں کہ انسان نباتات اور جانوروں کے سلسلے سے ہوتا ہوا وجود میں آیا ہے

آیت مندرجہ بالا میں ”نبت“ کا لفظ لغوی اعتبار سے ہر بڑھنے والی چیز پر لہ لاجاتا ہے

نباتات، حیوانات اور انسان سب پر اس کا یکساں استعمال ہوتا ہے۔ (امام راجب) اس کی

دوسری خصوصیت یہ ہے کہ جب کوئی چیز خوب پھل پھول رہی ہو تو یہ لفظ استعمال ہوتا ہے

مثلاً ”نبت الغلام“ بمعنی ”لڑکے کا جوان ہونا، بچہ کی پرورش کرنا“ لازم و مستعدی دونوں طرح

استعمال ہوتا ہے۔ (المبند) ”نبت شدی الجارية“ ”لڑکی کے پستان ابھر آنا“ (ملفتی

الادب) اسی طرح جب ایک بچہ کی اس طرح پرورش ہو رہی ہو کہ وہ اپنی اصل عمر سے بڑا اور خوب

پلا پورا معلوم ہوتا ہو تو ”نبت“ کا لفظ استعمال ہوتا ہے چنانچہ قرآن میں ہے :

”فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُولٍ حَسَنٍ وَأَنْبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا“ (ال عمران ۳۶)

”تو خدا نے مریم کو پسندیدگی کے قابل قبول فرمایا اور اسے اچھی طرح پرورش کیا۔“

اندرین صورت حال یہ آیت بھی نظریہ ارتقاء کی کوئی موثر دلیل نہیں ہو سکتی۔
 ۵۔ قصہ آدم کے سلسلہ میں پروریز صاحب نے درج ذیل آیت کی طرف توجہ مبذول کرائی ہے کہ ۱

”وَلَقَدْ خَلَقْنَاكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنَاكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ“

(الاعراف ۱۱)

”اور ہم نے تمہیں پیدا کیا، پھر تمہاری شکل و صورت بنائی، پھر فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کرو“

اس سے آپ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ آیت مذکورہ میں جمع کا صیغہ اس بات کی دلیل ہے کہ آدم سے پہلے بنی نوع انسان موجود تھی۔ کیونکہ ملائکہ کے سجدہ کا ذکر بعد میں ہوا ہے پھر سورۃ اعراف کی آیات ۱۱-۲۵ تک توجہ دلائی ہے جہاں کہیں آدم اور اس کی بیوی کے لیے تقنیہ کا صیغہ آیا ہے، لیکن اکثر مقامات پر جمع کا صیغہ ہے۔

اس کے جواب میں اتنا ہی عرض کریں گے کہ آپ اگر آیات (۱۱-۲۵) کے بجائے (۲-۲۵) پر غور کرنے کو فرمادیتے تو تنبیہ کے صیغہ کی حقیقت معلوم ہو جاتی۔

ابتداء میں حضور اکرم ص کے دور کے تمام موجود انسانوں کو مخاطب کیا گیا ہے کہ ”اپنے پروردگار سے نازل شدہ وحی کی تابعداری کرو“ پھر آگے چل کر آدم، آپ کی بیوی اور ابلیس وغیرہ کا قصہ مذکور ہے تو قرآن میں حسب محل صیغوں کا استعمال ہوا ہے۔ ان آیات کے مخاطب آدم اور ان کی اولاد ہے نہ کہ آدم اور ان کے آباؤ اجداد یا بھائی بند، جو آپ کے خیال میں اس جنت میں رہتے تھے جس کے متعلق خدا نے فرمایا:

”يٰۤاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ“

”اے آدم تم اور تمہاری بیوی جنت میں رہو“

اگر جنت میں اس آدم کی سابقہ نسل بھی رہتی تھی تو محض آدم اور اس کی بیوی کو جنت میں رہنے کی ہدایت بالکل بے معنی ہو جاتی ہے۔

اس آیت کا دوسرا پہلو جس کی طرف توجہ دلائی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے صرف حضرت آدم کو بطور خصوصی تخلیق پیدا کیا تھا تو آیت بالا میں ”کم“ کی ضمیر جمع کیوں استعمال ہوتی ہے؟ تو ہم عرض کریں گے کہ محاورہ عرب میں موقع و محل کے لحاظ سے واحد کے لیے جمع

کے استعمال کی اور بھی کئی مثالیں پائی جاتی ہیں مثلاً اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

”والذی جاء بالصدق وصدق به اولیک هم المتقون“

”اور جو شخص سچی بات لے کر آیا اور جس نے اس کی تصدیق کی وہی لوگ متقی ہیں“

تخلیقِ آدم سے متعلق سورج ذیل آیت اپنے مفہوم میں بالکل صاف ہے۔ ارشادِ باری ہے:

”هَذَا اِنِّیْ عَلٰی الْاِنْسَانِ حَیْنٌ مِّنْ الدَّهْرِ لَمَرِیْکُنْ شَیْئًا مَّذْکُورًا“

(الدھر)

”بے شک انسان پر زمانے میں ایک ایسا وقت بھی آچکا ہے کہ وہ کوئی قابلِ فکر چیز نہ تھا“

اب دیکھیے ”دہر“ سے مراد وہ زمانہ ہے جس کا آغاز ابتدائے آفرینش سے ہوا ہمارے عصر سے مراد وہ زمانہ ہے جس کا آغاز تخلیقِ آدم سے ہوا ہے کیونکہ انسانی افعال و اعمال پر اللہ نے عصر کو بطور شہادت پیش کیا ہے ہر کو نہیں۔ ارشادِ باری ہے کہ اس ”دہر“ میں انسان پر ایسا وقت بھی آیا ہے جبکہ وہ کوئی قابلِ ذکر چیز نہ تھا۔ اگر وہ نباتات و حیوانات یا بندر کی اولاد ہوتا تو یہ چیزیں تو سب قابلِ ذکر ہیں۔ اخوان کا نام لینے میں کیا حرج تھا؟ ہمارے خیال میں یہی آیت ڈارون کے نظریۂ ارتقاء کو کلی طور پر مردود قرار دینے کے لیے کافی ہے۔

تخلیقِ آدم اور قرآن:

اب دیکھیے اللہ تعالیٰ نے انسان کی پیدائش کے جو مختلف مراحل بیان فرمائے ہیں، وہ یہ ہیں:

۱۔ تراب بمعنی خشک مٹی (المومن ۶۷، ۲)۔ ارض بمعنی عام مٹی یا زمین (نور ۱۷، ۳)۔ طین بمعنی گیلی مٹی گارا (الانعام ۲۱، ۴)۔ طین لازب بمعنی لیسدار اور چپک دار مٹی (الصفت ۱۱، ۵)۔ حمأ مسنون بمعنی بدبودار کچھڑ (الحجر ۲۶، ۶)۔ صلصال بمعنی ٹھیکڑا۔ حرارت سے پکائی ہوئی مٹی (الصفا ۷، ۷)۔ صلصال کا لغو بمعنی ٹپ سے بچنے والی ٹھیکڑی۔ (الرحمن ۱۴)۔

یہ ساتوں مراحل بس جمادات میں پورے ہو جاتے ہیں۔ مٹی میں پانی کی آمیزش ضرور ہوتی لیکن پھر وہ بھی پوری طرح خشک کر دیا گیا۔ غور فرمائیے کہ اللہ تعالیٰ نے تخلیقِ انسان کے حیرت انگیز مراحل بیان فرمائے ہیں وہ سب کے سب ایک ہی نوع (جمادات) سے متعلق ہیں۔ ان میں کہیں نباتات اور حیوانات کا ذکر آیا ہے؟ اگر انسان کی تخلیق نباتات اور حیوانات کے راستے

سے ہوتی تو ان کا بھی کہیں تو ذکر ہونا چاہیے تھا۔

پھر قرآن میں یہ بھی مذکور ہے :

”قَالَ يَا ابْنِ آدَمُ اسْلُكْ هَذَا الْجَنَّةَ لَا تَخْرُجْ مِنْهَا“ (الزمرہ ۷)

”خدا نے فرمایا کہ اے ابلیس جس شخص کو میں نے اپنے ہاتھوں سے بنایا اس کے آگے سجدہ کرنے سے تجھے کس چیز نے منع کیا؟“

اب خدا کے ہاتھوں سے اس لیے انکار کر دیا جائے کہ خدا کے متعلق تجریدی تصور ہی راہ صواب ہے۔ یا ”ید“ سے مراد قوت و قدرت ہے اور حدیث اگر آیت کی تائید کرے تو اسے ظنی کہہ دیا جائے اور اگر توہم بھی تائید کرے تو اس کی ہر ایسی آیت کو محرف قرار دیا جائے جو آپ کے قرآنی فکر سے متصادم ہو۔ یہ سب کچھ کر لینے کے بعد نظریہ ارتقاء جیسے ناقابل اعتماد نظریہ کو صحیح قرآنی فکر قرار دیا جائے تو دلائل کی بات رہ کہاں جاتی ہے؟

قصۂ آدم و ابلیس

جنت، شجر ممنوعہ اور بیہوش آدم :

اب پرویز صاحب کی زبانی سنئے کہ آدم و ابلیس کی تمثیلی داستان کیا ہے؟ اور جنت (ابلیس) آدم، ملائکہ وغیرہ سے کیا مفہوم ہے؟ فرماتے ہیں :

”جنت کی زندگی سے مراد نوع انسانی کی زندگی کا وہ ابتدائی دور ہے جس میں رزق کی فراوانیاں تھیں۔ انسان ملکیت کے لفظ سے نا آشنا تھا، جس کا جہاں جی چاہے سامان زیست لے لیتا۔ جس کا پہلا دور قبائلی زندگی کا تھا۔ یعنی اب نوع انسانی مختلف ٹکڑوں میں بٹ کر الگ الگ ہو گئی۔

عربی زبان میں الگ الگ ہونے کو مشابرت کہتے ہیں۔ اسی کا نام وہ شجر ہے جس کے قریب جانے سے انسان کو روکا گیا تھا“ (ابلیس و آدم ص ۵۱، ۵۲)

لہ سرید جنت سے مراد انسان کا ہمہ طفلی و شجر ممنوعہ سے مراد عقل و شعور اور بیہوش آدم سے مراد عقل و شعور کے بعد کی زندگی لیتے ہیں۔ پرویز صاحب اسی مسئلہ میں سید صاحب سے پوچھا کہ اختلاف رکھتے ہیں اور بالکل نئی تاویلات پیش فرماتے ہیں۔

اب دیکھیے کہ (۱) اگر جنت سے مراد رزق کی فراوانیاں ہی ہے تو اس سے تو انسان کے سب آباء و اجداد اور دیگر حیوانات فائدہ اٹھا رہے تھے۔ آدم و حوا کو جنت میں آباد کر کے خدا نے اس جوڑے پر کون سا احسان فرمایا تھا؟

۲۔ مشابہت کے معنی تو واقعی الگ الگ ہونے کے ہیں۔ لیکن دیکھنا تو یہ ہے کہ آیا مشابہت اور شجر کے ایک ہی معنی ہیں؟ شجر اہم جنس ہے اور شجرہ کسی ایک درخت کو کہتے ہیں؛ الگ الگ بننے کو نہیں کہتے۔ جب بھی یہ لفظ بطور اہم استعمال ہوا اس کے معنی درخت ہی ہوں گے۔

۳۔ جس کسی آدمی کو اللہ نے اس شجر یا مشابہت سے منع کیا تھا یعنی الگ الگ ٹکڑوں میں بٹ جانا، وہ تو پہلے ہی واقع ہو چکا تھی۔ ایک چیز کے ہو جانے کے بعد یہ کہنا کہ ایسا نہ کرنا، کیا معنی رکھتا ہے؟

ابلیس اور ملائکہ؛

”انفرادی عقل کا یہ تقاضا کہ دنیا میں سب کچھ میرے ہی لیے ہونا چاہیے، ابلیس کہلاتا ہے“

”ملائکہ یعنی کائنات کی قوتیں (جن سے رزق پیدا ہوتا ہے) انسان کے تابع فرمان ہیں.... وہ سب اس کے سامنے سجدہ ریز ہیں“ (ص ۵۲ ایضاً)

”وہ جذبہ جس کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ ابلیس نے آدم کے کان میں یہ افسوس بھونک دیا کہ وہ اسے حیات جاوید عطا کرے گا اور اس کا ذریعہ بتلایا اولاد۔ یہ ہے مضمون اس تمثیلی بیان کا جس میں کہا گیا ہے کہ اس حیات جاوید کے حصول کی تمنا میں انسان کے جنسی ترغیبات ابھر کر سامنے آ گئے۔“

(ابلیس و آدم ص ۵۳)

۱۔ اب دیکھیے، ابلیس کی کئی تعبیریں یہ لوگ کرتے ہیں۔ کہیں اس سے مراد عقل بیباک ہوتی ہے جو وحی کے تابع نہ ہو۔ کہیں ابلیس سے سرکشی اور نفاذات مضمون لیا جاتا ہے۔ کہیں اسے ذاتی مفاد سے تعبیر کیا جا رہا ہے۔ یہ لفظ بس موم کی ناک ہے جو صرچا ہیں موڑ لیں۔ البتہ ان سب معانی میں ایک بات بطور قدر مشترک ضرور پائی جاتی ہے اور وہ یہ ہے کہ ابلیس کوئی علیحدہ چیز نہیں ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ابلیس نے تو خدا کے سامنے جھکنا ہی یہ کھڑ کیا تھا کہ

میں آدم سے افضل ہوں۔ اگر انسان کے علاوہ ابلیس کا تصور ممکن نہیں تو یہ جھگڑا آخر کس نے کیا اور کس سے کیا۔؟

۲۔ یہی حال لفظ ”ملائکہ“ کا ہے، لیکن اس سے مراد انسان کے اندر نیکی کی قوتیں سمجھا جاتا ہے۔ کبھی اسے ملکہ فطری سے تعبیر کیا جاتا ہے کبھی کائنات کی خارجی قوتوں سے۔ اس مقام پر ان قوتوں کو رزق سے محدود کر دیا گیا ہے۔ ان سب تعبیروں میں قدر مشترک یہی ہے کہ ملائکہ اپنا کوئی خارجی وجود یا شخص نہیں رکھتے جبکہ قرآن مجید سے یہ ثابت ہے کہ ان کا خارجی وجود ہے اور ان پر ایمان لانا ایمان بالغیب کا ایک حصہ ہے۔

۳۔ ابلیس کے قریب سے آدم اور اس کی بیوی نے درخت کا پھل چکھ لیا تھا۔ پرویز صاحب فرماتے ہیں کہ وہ پھل جنسی ترغیبات تھیں جس کے ذریعے اولاد پیدا ہوتی ہے اور انسان بزرگم خود حیاتِ جاوید حاصل کر لیتا ہے۔“

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ (اس نظریہ کے مطابق) جنسی ترغیبات تو انسان سے بہت پہلے بندر میں بھی اور اس سے پہلے دیگر حیوانات میں بھی موجود تھیں اور اس سے بہت عرصہ بعد انسان غیر انسانی اور نیم انسانی حالتیں طے کرتا ہوا انسان بن رہا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ اور اولاد کا سلسلہ بھی بندروں میں موجود تھا۔ پھر اس مقام پر ابلیس نے آدم کو جنسی ترغیبات کی یہ کیا پٹی پڑھائی تھی؟

نظریہ ارتقاء اور اسلامی تعلیمات کا تقابل

۱۔ قرآن انسان سے متعلق اشرف المخلوقات کا تصور پیش کرتا ہے جبکہ نظریہ ارتقاء اسے بندر کی اولاد قرار دے کر اسے پست مقام پر لے آتا ہے۔ بندر انسان کے بمقابلہ حقیر تر اور ذلیل تر مخلوق ہے جس کا اعتراف سرسید احمد نے بھی کونوا قودۃ خاستین کی تفسیر کے تحت کیا ہے۔

مغربی مفکرین کی یہ عجیب ستم ظریفی ہے کہ انہوں نے جب بھی انسان سے متعلق اپنے نظریات پیش کیے ہیں تو اسے حیوانی سطح سے اوپر نہیں اٹھنے دیئے۔ ارسطو نے انسان کو حیوانِ ناطق کہا، ڈارون نے اسے بندر کی اولاد قرار دیا۔ سگنڈ فرائڈ نے اسے جنسی حیوان کہا اور مارکس ولین نے انسان کو معاشی حیوان سے تعبیر کیا جبکہ قرآن انسان کو تمام مخلوقات سے بلند تر مقام پر فائز

کرتا ہے۔ ارشاد باری ہے :

”وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ وَحَمَلْنَاهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنَاهُمْ مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَى كَثِيرٍ مِمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيلًا“

(بنی اسرائیل - ۷۰)

”اور ہم نے بنی آدم کو عزت بخشی اور ان کو جنگل اور دریا میں سواری دی اور پاکیزہ روزی عطا کی اور اپنی بہت سی مخلوقات پر فضیلت دی“

۲۔ نظریہ ارتقاء وحدت حیات کا تصور پیش کرتا ہے جبکہ قرآن مجید ”كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً“ کہہ کر وحدت امت کا تصور پیش کرتا ہے۔ وحدت امت سے مراد یہ ہے، کہ جو حقوق اللہ نے انسان کو دیے ہیں دوسری محی مخلوق کو نہیں دیے۔ مثلاً انسان حلال جانوروں کو ذبح کر کے کھا سکتا ہے اور ان سے اور بھی کئی طرح سے استفادہ کر سکتا ہے لیکن نفسیہ وحدت حیات انسان کو ایسے حقوق عطا نہیں کرتا۔ اسی بنا پر ہندوؤں کے ہاں انہماک اصول کار فرما ہے اور وحدت الوجود کے قائلین جانوروں کو بھی بالکل اپنے ہم مرتبہ تصور کرتے ہیں۔

۳۔ اسلامی تعلیمات کا انحصار ایمان بالغیب پر ہے۔ ایمان بالغیب کے اجزاء یہ ہیں :

خدا پر ایمان، فرشتوں کے خارجی وجود پر ایمان، نبیوں پر ایمان، الہامی کتابوں کو یوم آخرت پر ایمان، جبکہ نظریہ ارتقاء ایمان بالغیب کے اکثر اجزاء کی جڑ کاٹ دیتا ہے جیسا کہ اس کتاب میں متفرق مقامات پر ذکر آیا ہے !

۴۔ نظریہ ارتقاء الحاد کی راہوں پر ڈال دیتا ہے۔ اس کا سب سے پہلے اثر اس نظریہ کے بانی ڈارون پر ہوا۔ اشتراکی دہریت پسند اس نظریہ کا پرچار صرف اسی لیے کرتے ہیں کہ یہ نظریہ مذہب سے دُور لے جاتا ہے۔ حالانکہ اشتراکی فلسفہ کی بنیاد نظریہ اعتداد یا جدلی نظریہ پر ہے جو نظریہ ارتقاء کے مخالف ہے۔ تاہم یہ لوگ نظریہ ارتقاء کا پرچار محض اس لیے کرتے ہیں کہ اس سے مذہب سے متنفر اور اشتراکیت کے لیے راستہ ہموار ہو سکے جو اس بات کی واضح دلیل ہے کہ نظریہ ارتقاء اسلام کے بنیادی عقائد سے براہ راست متصادم ہے۔

نظریہ ارتقاء کا مستقبل :

نظریہ ارتقاء کا مطالعہ کرنے سے ان خودیہ سوال ذہن میں ابھرتا ہے کہ انسان ہر اقلیٰ منازل طے کرتا ہوا حیوانیت سے گزر کر درجۃ انسانیت تک پہنچا ہے، تو اب اس کی اگلی منزل

کیا ہوگی؟ یہ نظریہ اگلی منزل کی کوئی نشاندہی نہیں کرتا۔ البتہ مغربی مفکرین یہ بات ضرور کہتے ہیں کہ اب انسان کی اگلی منزل طبعی نہیں بلکہ ذہنی ہوگی۔ پرویز صاحب اس سوال کے جواب میں پروفیسر جیوڈ کا اقتباس نقل کرتے ہیں:

”انسانیت کے ارتقاء کی اگلی منزل طبعی نہیں بلکہ ذہنی اور نفسی ہوگی۔ پہلے پہل انسان ارتقاء کی منزلیں طے کر کے حیوانیت سے انسانیت کے درجہ پر آیا۔ پھر اس نے صنعت و حرفت کی مدد سے اپنے آپ کو آلات و اسباب سے آراستہ کیا۔ ہمارے اس دور میں انسان نے صنعت و حرفت پر پورا کمال حاصل کر لیا ہے۔ اب اس کے لیے ضروری ہو گیا ہے کہ وہ اس منزل سے آگے بڑھے اور جس طبعی ارتقاء نے اسے مجبور کر دیا تھا کہ وہ حیوان سے ترقی کر کے انسان کے درجے میں قدم رکھے پھر اس کی جتنی ضرورتوں نے اوزار و آلات نبوائے اور وہ مشین اسٹیم کا خالق بنا۔ اسی طرح وہ آج مجبور ہے کہ اپنا قدم آگے بڑھائے اور اس کا یہ قدم مادی نہیں بلکہ ذہنی اور نفسی ترقی کی طرف ہوگا۔“
(دقرآنی فیصلے ص ۳۴۰)

مندرجہ بالا اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ:

۱۔ انسان کے اس فجائی ارتقاء نے، جس سے اسے قرب اختیار و ارادہ حاصل ہوا تھا۔ اس کے مادی ارتقاء کو ختم کر دیا ہے۔ بالفاظ دیگر ڈارون کے نظریہ ارتقاء کی آخری منزل بس انسان ہی ہے۔

۲۔ اگر طبعی ارتقاء ہی نے حیوانی زندگی کو مجبور کیا تھا کہ وہ انسانی زندگی میں قدم رکھے تو حیوانی زندگی تو آج بھی موجود ہے لیکن کیا طبعی ارتقاء نے کسی حیوان کو مجبور کیا ہے کہ وہ انسانی زندگی میں قدم رکھے؟ اگر ایسا نہیں اور یقیناً ایسا نہیں تو یہ نظریہ از خود غلط قرار پاتا ہے۔

۳۔ ذہنی ترقی تو واضح ہے کہ کبھی پتھر کا زمانہ تھا، پھر دھات کا زمانہ آیا، پھر صنعت و حرفت کا۔ آج ایٹمی دور ہے لیکن اس میں نفسی ترقی کی کیا بات ہوئی؟

صراطِ مستقیم کیا ہے؟

پرویز صاحب کا نظریہ ارتقاء سے متعلق ایک مضمون پڑھنے کے بعد کسی نے سوال کیا کہ ”آپ نے لکھا کہ انسان سلسلہ ارتقاء کی اوپر کی کڑی ہے تو اس سے ظاہر ہے کہ

انسان میں مادی تفرقات سے زیادہ اور کچھ نہیں۔ مادہ پرست بھی یہی کہتے ہیں۔ یہ کس طرح درست ہو سکتا ہے، اگر یہ ارتقاء مادی ہے تو انسان کا مزید ارتقاء بھی مادی ہونا چاہیے، کیا صراطِ مستقیم پر چلنے کے معنی یہی ہیں؟ یعنی جس خط پر اس وقت تک ارتقاء ہوتا چلا آیا ہے اسی پر آگے ارتقاء ہو؛ (دقرآنی فیصلے ص ۳۳۵)

اس خط سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ صراطِ مستقیم سے مراد پرویز صاحب کے نزدیک وہ لائن ہے جس پر زندگی سفر کرتی ہوئی پہلے جرثومۂ حیات سے انسان تک پہنچی ہے اور اس صراطِ مستقیم کی اتنی منازل انسان طے کر چکا ہے، اب یہ صراطِ مستقیم آگے کہاں جاتا ہے اس کی تفصیل بھی پرویز صاحب کی زبانی ملاحظہ فرمائیے:

آپ نے صراطِ مستقیم سے جو مفہوم اخذ کیا ہے وہ حقیقت پر مبنی نہیں۔ قرآن کی یہ جامع اصطلاح بڑے اہم نکات کی حامل ہے۔ جیسا کہ میں اوپر لکھ چکا ہوں، قرآن سے پہلے ذہن انسان کی دوری حرکت کا قائل تھا جس میں آگے بڑھنے کا تصور ہی نہ تھا۔ قرآن نے زندگی کا ترکیباتی (Dynamic) تصور پیش کر کے بتایا کہ حیات کبھی چسکر میں گردش نہیں کر رہی بلکہ اپنے ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی آگے بڑھ رہی ہے لہذا اس کی حرکت آگے بڑھنے والی ہے۔

صراطِ مستقیم سے اس غلط فلسفہ حیات (یعنی زندگی کے چکر میں گردش کرنے) کا ابطال ہو گیا اور اس صحیح مقصود حیات (یعنی زندگی کے آگے بڑھنے) کا اثبات ہو گیا، پھر چونکہ مستقیم میں توازن قائم رکھنے کا پہلو بھی معنور ہے۔ اس لیے یہ حقیقت بھی سامنے آگئی کہ زندگی مختلف قوتوں میں توازن قائم رکھتے ہوئے آگے بڑھنے کا نام ہے۔ اس کے ساتھ ہی قرآن نے یہ بھی بتایا کہ ”صراطِ مستقیم“ پر چلنے سے مراد یہ نہیں کہ زندگی اپنی موجودہ سطح پر چلتی رہے گی۔ زندگی کی راہ میں بھی ہے اور طعنیوں کی طرف جانے والی بھی۔ یعنی ایسا خط جو کبھی نیچے طبقے سے اوپر کے نقطے کی طرف جاتے۔ (توسیع طبقا عن طبقہ) تاکہ تم طبقاً طبقاً اوپر چڑھتے چلے جاؤ گے۔ اس سے زیادہ واضح الفاظ میں بتا دیا کہ صراطِ مستقیم تمہارے اس نشوونما دینے والے (رب) کی راہ (قانون) ہے جو ذی معارف (خ) ہے یعنی میرٹھویوں والا خدا۔ میرٹھوی سیدھی بھی ہوتی ہے اور اوپر لے جانے کا ذریعہ

بھی۔ گھسٹتے ہوئے اوپر جانے کا ذریعہ نہیں بلکہ الجھرتے ہوئے (موجھول) کرتے ہوئے) اوپر چڑھنے کا ذریعہ، یہ وہ ذریعہ ہے جس سے انسان اقطار السموات والارض یعنی موجودہ زمان و مکان کی حدود سے آگے بھی نکل سکتا ہے۔“

(ایضاً ص ۳۴۲)

سو یہ ہے وہ صراطِ مستقیم جس پر آئندہ انسانی زندگی کا ارتقاء ہوگا۔ گریا آپ کے خیال میں قرآن صرف نظریۂ ارتقاء کی یہ پیچیدگی حل کرنے کے لیے نازل ہوا تھا کہ آئندہ زندگی کا سفر کس لائن پر ہوگا اور وہ لائن کیسی ہوگی؟ غور فرمائیے کہ انسان کے اولین مخاطب جو انپڑھتے انہوں نے اس فلسفیانہ پیچیدگیوں کو سمجھ لیا ہوگا؛ بہر حال آپ نے سیاق و سباق سے قطع نظر کہتے ہوئے کوئی آیت ہمیں سے لی اور کوئی کہیں سے اور یہ ثابت کر دیا ہے کہ زندگی کی صراطِ مستقیم جو انسانی زندگی تک زمین ہی پر تھی اب وہ اوپر کی طرف چڑھے گی۔ مگر سوال یہ ہے کہ زندگی کو اس صراطِ مستقیم کے ذریعہ اوپر چڑھنے کا فائدہ کیا ہوگا۔ آپ کے نزدیک اوپر کوئی خدا تو ہے نہیں، وہ تو ہر جگہ موجود ہے، پھر اوپر جا کر زندگی کسے گی کیا؟ ایک روحانی بزرگ صراطِ مستقیم کا تصور کچھ اس طرح پیش کرتے تھے کہ ذاتِ باری سے ہر ایک جاندار ایک روحانی شعاع کے ذریعے منسلک ہے اور اس کی دلیل میں وہ یہ آیت پیش کرتے تھے،

”ما من دابة الا هو اخذ بناصيته“ (ہود ۵۶)

” (زمین پر) جو کوئی چلنے پھرنے والا ہے خدا اس کی چوٹی کو پکڑے ہوئے ہے۔“
ان کے تصور کے مطابق اس روحانی شعاع کا ایک سراہر جاندار کے دماغ میں بیوست ہے اور دوسرا خدا کے ہاتھ میں ہے۔ یہی روحانی شعاع صراطِ مستقیم ہے اور اسی پر روحانی سفر ہوگا۔ اس زمین کے اوپر ہوائی کرہ کے بعد سب سے پہلے جہنم آتا ہے پھر اعراف، پھر جنت، پھر عالمِ لاہوت، ملکوت، مثال اور عالمِ امر ہیں۔ پھر اس کے بعد عرشِ الہی ہے اور اس سے اوپر ذاتِ باری تعالیٰ۔ اور بزرگم خویش یہ بزرگ یہ روحانی سفر طے بھی کر چکے تھے۔ ان کی صراطِ مستقیم سے متعلق یہ تحقیق یا ان کی دوسری تحقیقات ٹھیک ہوں یا غلط، اس سے ہمیں سروکار نہیں۔ البتہ ایک بات ان کی قابلِ فہم ہے اور وہ یہ کہ وہ خدا کو اوپر سمجھتے تھے، لہذا ان کی صراطِ مستقیم کا رخ اوپر کی طرف ہی ہونا چاہیے تھا مگر پرویز صاحب کے نزدیک خدا اوپر تو ہے نہیں

بلکہ ہر جگہ موجود ہے۔ پھر انہیں صراطِ مستقیم کو اوپر کی طرف لے جانے کی کیا ضرورت پیش آئی؟ اور یہ سوال بھی تاحال حل طلب ہے کہ اس صراطِ مستقیم کے ذریعہ ارتقاء کی اگلی منزل کیا ہوگی؟ اس سلسلہ میں آپ فرماتے ہیں:

ارتقاء کی اگلی منزل:

”ان تصریحات سے آپ نے دیکھ لیا ہو گا کہ نہ تو انسان خالص طبیعی ارتقاء کی آخری کڑی ہے۔ (بلکہ اس کی انسانیت طبعی ارتقاء کے سلسلہ علت و معلول سے الگ ہے) اور نہ ہی اس کا مزید ارتقاء طبعی ہو گا۔ طبیعی ارتقاء کی پیداوار صرف اس کا جسم ہے، اس میں جوہر انسانیت غیر طبعی ہے۔ جسم انسانی میں اس جوہر انسانیت کے فیصلوں کے لیے معلومات فراہم کرنے کا ذریعہ۔ اس کے بعد مزید ارتقاء جسمانی نہیں بلکہ جوہر انسانیت کا ہو گا جسے ہم موت کہتے ہیں، وہ حقیقت جوہر انسانیت کا جسم کے آسروے کو چھوڑ دینے کا نام ہے۔ جوہر انسانیت (انسانی اختیار و ارادہ) کی نشو و ارتقاء قرآنی نظامِ ربوبیت سے ہوتی ہے، زندہ وہ ہے جس کے اختیار و ارادے کی قوتیں (قرآن کی روشنی میں) تمام خارجی کائنات کو (جس میں خود اس کا جسم بھی شامل ہے) مسخر کیے جاتی ہیں نہ کہ وہ جس کے جسم کی طبیعی مشینری چل رہی ہے۔ جو اس طرح زندہ ہے وہ موت سے مر نہیں سکتا، اسی کا نام ارتقاء کی اگلی منزل ملے کرنا ہے۔“ (ایضاً ص ۳۲۸)

اس اعتبار سے معلوم ہوتا ہے کہ:

- ۱۔ ارتقاء کی اگلی منزل موت ہے۔ جب جسم کا آسرا ختم ہو جائے گا۔
 - ۲۔ لیکن یہ ارتقاء کی منزل دہی ملے کر سکے گا جس کا جوہر انسانیت نشو و نما یافتہ ہو۔
- جو قرآنی نظامِ ربوبیت کے اختیار کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ موت تو سب کو آتی ہے اور جسم کا آسرا بھی سب کا ختم ہوتا ہے۔ جو لوگ نظامِ ربوبیت کے ذریعہ اپنے جوہر انسانیت کی نشو و نما کر لیں گے۔ وہ تو ارتقاء کی اگلی منزل ملے کر جائیں گے اور جو اس نظام کو اختیار نہیں کرتے یا اس پر ایمان نہیں لاتے ان کا کیا بنے گا؟
- آخرت کا تصور:**

”جسم کا کام انسانی قوت فیصلہ (نفس) کے لیے معلومات فراہم کرنا اور اس کے

فیصلوں کو جاری کرنا ہوگا (یعنی قرآنی نظام ربوبیت یا قرآنی معاشرے میں) اس قوت میں جس قدر بچگی اور وسعت ہوتی جائے گی، اسی قدر انسانی زندگی ابدیت سے ہمکنار ہوتی جائے گی۔ جب جسمانی نظام طبیعی قانون کے تحت مضحمل ہو کر منتشر ہو جائے گا (جسے موت کہتے ہیں) تو اس بچگی اور وسعت یافتہ قوت (نفس) کا کچھ نہیں بگڑے گا، اس کے بعد اسے معلومات فراہم کرنے اور اس کے فیصلوں کو نافذ کرنے والا (در نظام مل جائے گا) (ایضاً ص ۳۴)

اس اقتباس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ موت کے وقت نظریہ ارتقار کا اصول بقا لا صلح *survival of the fittest* لاگو ہوگا۔ پھر جس انسان نے اپنے نفس کو قرآنی نظام ربوبیت کے ذریعہ جس قدر بہتر کر لیا ہوگا، اسی قدر اس کا نفس ابدیت سے ہمکنار ہوگا۔ اسی نظریہ کا دوسرا پہلو یہ بھی نکلتا ہے کہ جن لوگوں نے اس نظام کے ذریعہ اپنے نفس کو بچتہ نہیں بنایا وہ ختم ہو جائیں گے اور تربیت یافتہ نفوس جو ابدیت سے ہمکنار ہونے والے ہیں۔ ان کو معلومات فراہم کرنے کے لیے (نیا جسم نہیں) بلکہ نیا نظام بھی مل جائے گا۔

اخروی زندگی

اب کسی صاحب نے اس نئے نظام کے متعلق آپ سے مزید روشنی ڈالنے کی درخواست کی تو آپ نے اس کی وضاحت بدیں الفاظ فرمائی،

”زندگی کی موجودہ منزل میں انسان کے لیے یہ ناممکن ہے کہ وہ زندگی کی آئندہ منزل کے متعلق کچھ معلوم کر سکے۔ ہمارے ذرائع معلومات، ہمارے حواس و احساسات ہیں اور ان کا تعلق محسوسات و مدركات سے ہے۔ لہذا جو چیزیں اس دائرہ سے باہر ہوں، ان کے متعلق ہم اپنے موجودہ ذرائع معلومات سے کچھ معلوم نہیں کر سکتے۔ آنے والی زندگی کیسی ہوگی؟ اس کا نظام کیا ہوگا؟ اس کی شکل و صورت کیا ہوگی؟ ہم نہیں جان سکتے۔ اس پر البتہ ہمارا ایمان ہے کہ زندگی کا سلسلہ غیر منقطع ہے، اس لیے اس زندگی کے بعد دوسری زندگی بھی یقینی ہے اب تو سائنس کی تحقیقات کا رخ بھی اس طرف ہے کہ اس زندگی کے بعد دوسری زندگی کا امکان یقینی ہے۔“

”علاوہ ازیں اس زندگی میں اس کاوش کی ضرورت بھی نہیں کہ آنے والی زندگی

کی کیفیت کیا ہوگی؟ آنے والی زندگی کا تعین قانونِ مکاناتِ عمل کے لیے ضروری ہے اور جس شخص کا ایمان ہے کہ زندگی مسلسل ہے۔ اس کا یہ ایمان قانونِ مکاناتِ عمل کی غیر منقطع ہمہ گیری کے لیے کافی ہے۔ یہی وہ ایمان ہے جس پر اسلامی تصویرِ حیات کی عمارت اٹھتی ہے۔ (ایضاً ص ۳۱)

سائل نے جو نئے نظام پر روشنی ڈالنے کے لیے کہا تو اس کا جواب آپ نے دو صورتوں میں دیا ہے۔

- ۱۔ ہم موجودہ احساسات سے اس نظام کو سمجھ نہیں سکتے۔
- ۲۔ اس نظام کو سمجھنے کی ہمیں اس دنیا میں کوئی ضرورت بھی نہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ قرآن نے جو آخرت، یومِ جزا و سزا، جنت و دوزخ کی لاتعداد تفصیلات بیان کی ہیں اور حضور اکرمؐ نے اپنی مکی زندگی کا بیشتر حصہ اس نئے نظام کو ہی ذہن نشین کرانے پر صرف کر دیا، کیا اس سے ہم صرف اس وجہ سے قطع نظر کر لیں کہ وہ نیا نظام ہمارے حیطہٴ ادراک سے باہر ہے۔ وحی سے روشنی حاصل کرنے اور ایمان بالآخرت کا کیا مطلب ہے؟ اب نئے نظام کے ادراک کی ضرورت تو یہ ہے کہ اسی ادراک اور عقیدہ کی بنا پر ہماری یہ دنیوی زندگی بگڑتی یا سورتی ہے۔ اگر انہیں جاننے کی ضرورت ہی نہیں تو قرآن نے اتنی تفصیلات کیوں بیان کی ہیں۔

آپ زندگی کے غیر منقطع ہونے پر ایمان صرف اس لیے نہیں رکھتے ہیں کہ اس پر اسلامی تصویرِ حیات کی عمارت اٹھتی ہے بلکہ اس کی دوسری وجہ بھی آپ نے بیان فرمادی ہیں۔

۱۔ اب تو سائنس کی تحقیقات کا رخ بھی اس طرف ہے کہ اس زندگی کے بعد دوسری زندگی کا امکان یقینی ہے۔

۲۔ مکاناتِ عمل کا وہ بے لچک قانون جو کائنات میں جاری و ساری ہے اور جسے مادہ پرست بھی تسلیم کرتے ہیں۔

ہمارے اس خیال کو بدظنی پر محمول نہ کیا جائے۔ اگر وحی پر ایمان لانے کی بات درست ہو تو پھر نئے نظام کی تفصیل میں ہمارے موجودہ حواس پر انحصار کی ضرورت بھی کب پیش آتی ہے؟ ایمان بالغیب تو اسی چیز کا نام ہے کہ جو باتیں ہمارے حیطہٴ ادراک سے باہر ہیں۔ انہیں ہم صرف اس لیے درست تسلیم کریں کہ وہ بذریعہ وحی ہم تک پہنچی ہیں۔

طلوع اسلام کا تضاد

پرویز صاحب بہر حال اس بات کے قائل ہیں کہ زندگی غیر منقطع ہے اور موت کے بعد بھی جاری رہے گی، لیکن آپ کے استاد جناب حافظ محمد اسلم صاحب مرنے کے بعد اور قیامت تک کے درمیانی عرصہ یعنی مدبرخ میں کسی طرح کی زندگی کے قائل نہیں۔ قرآنی نیکلے میں ایک طویل مضمون، عذاب قبر کے عنوان سے شائع ہوا ہے جس میں حافظ صاحب موصوف نے بلا ل ثابت کیا ہے کہ از روئے قرآن مدبرخ میں کوئی زندگی نہیں، جبکہ پرویز صاحب زندگی کے غیر منقطع ہونے کے قائل ہیں۔

(بقیہ الاستفتاء ص ۹ سے آگے)

متقاضی ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ نمازی کے آگے سے گزرنے والے آدمی کے لیے یہی بہتر ہے کہ وہ چالیس روز یا اس سے بھی زیادہ عرصہ تک کھڑا رہے، اس سے مقصود یہ ہے کہ کسی نماز ادا کرنے والے کی نماز توڑنا بہر کیفیت ایک عظیم گناہ ہے جس سے پرہیز لازم ہے۔ ہاں اگر کسی آدمی کو بہت جلدی ہو اور وہ نماز کی فراغت تک نہ ٹھہر سکتا ہو تو پھر حکم یہ ہے کہ وہ نماز ادا کرنے والے کے سامنے سے تین چار صفوں کا فاصلہ چھوڑ کر آگے سے گزر جائے۔ ان شاء اللہ علیا کرنے میں گزرنے والے کو گناہ لازم نہیں ہوگا اور نہ نماز پڑھنے والے کی نماز میں کوئی خلل آئے گا۔ ان دونوں احادیث میں علما۔ حدیث نے یہی تطبیق دی ہے۔ یہ دونوں احادیث مشکوٰۃ المصابیٰ کتاب الصلوٰۃ میں موجود ہیں۔

پس فتوے تو یہی ہے کہ اتنے فاصلہ سے گزر سکتا ہے، مگر فتوے یہ ہے کہ نماز کی فراغت تک وہیں کھڑا رہے۔ یہی اولیٰ اور اخلاص ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب